Urdu Studies
An international, peer-reviewed, bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 5 | Issue 1 | Year 2025
Pages: 100-114

اسلامی تہذیب، شعر و ادب اور آج کی دنیا

این میری شمل

ترجمہ: مہر افشاں فاروقی

جناب صدر، خواتین و حضرات،

میں آپ کی رہ نما تقریر کے لیے ممنون ہوں۔ آپ نے مجھے خراج تحسین پیش کیا اور جس پر زور طریقے سے آپ نے ہماری خارجہ پالیسی میں معاشروں کے سمجھنے اور ان کے ساتھ رواداری برتنے کی اہمیت واضح کی وہ میرے لیے بے حد مسرت کا باعث ہوا۔ مجھے جب یہ اطلاع ملی کہ مجھے امن انعام کے لیے منتخب کیا گیا ہے تو میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بھلا کون یہ تصور کر سکتا تھا کہ آنے والے مہینوں میں ایک ایسی طاقتور تحریک شروع ہو جائے گی جو عنقریب میری زندگی بھر کی محنت پر پانی پھیر دے گی، میری اس محنت پر جس کا مقصد مشرق اور مغرب کے درمیان افہام اور تفہیم کو فروغ دینا تھا؟ لیکن انعام قبول نہ کرنے کے لیے مجھ پر جو دباؤ ڈالا جا رہا تھا اس کے سامنے میں نے گھٹنے نہیں ٹیکے، کیونکہ مجھے یہ احساس تھا اور ہے کہ مجھے ان مستشرقین کے تئیں ایک ذمہ داری نبھانی ہے جو خاموشی سے ایک مکالمے کی تلاش میں ہیں اور یہ ذمہ داری مجھے ان لوگوں کے ساتھ بھی نبھانی ہے جو اسلامی

ISSN: 2583-8784 (Online)
Included in UGC-CARE List since October 2021
Published on August 15, 2025
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/?ref=chooser-v1

دنیا میں ہیں اور جو اس کے بارے میں نیک خواہشات رکھتے ہیں۔ اور پھر یہ ذمہ داری خود مجھے اپنی کوششوں کے تئیں بھی نبھانی ہے جو میں نے تاحیات اس سلسلے میں کی ہیں۔

میں امید کرتی ہوں کہ جن لوگوں نے مجھے جانے بغیر، میری تصانیف پڑھے بغیر، مجھ پر حملے کیے انھیں کبھی ایسی آزمائش سے نہ گزرنا پڑے گا۔

میں نے اب یہ سمجھ لیا ہے کہ علم دوستی اور شاعری کے طور طریقے اور ہیں اور صحافت اور سیاست کے کچھ اور۔ بہر حال جاہلین اس بات کے قائل ہیں کہ 'لفظ' خاص طور پر آزاد 'لفظ' ہماری زندگی اور معاشرے میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ میرے پاکستانی شاعر دوست فیض نے جیل میں یہ نظم پچاس کی دہائی میں لکھی تھی۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہیں آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

اور یہ نظم مجھے میری آج کی اس تقریر کے موضوع تک لاتی ہے۔

Urdu Studies
Vol. 5 | Issue 1 | Year 2025

مجھے اکثر یہ خیال آیا ہے کہ اگر فریڈرش روکرٹ[1] (۱۷۸۸ تا ۱۸۶۶) آج زندہ ہوتا تو وہ ضرور اس انعام کا حقدار ہوتا کیونکہ اس کا مقولہ تھا ”عالمی شاعری ہی آپسی عالمی سمجھوتے کا راستہ دکھاتی ہے۔“ اپنی زندگی میں اس نے درجنوں زبانوں سے ہزاروں نظموں کے عمدہ ترجمے کیے۔ اور وہ جانتا تھا شاعری ”نوع انسان کی مادری زبان ہے۔“ وہ انسانوں کے درمیان رشتے جوڑتی ہے کیونکہ یہ تمام تہذیبوں کا حصہ ہے۔

پھر بھی، جس دور میں روکرٹ نے شاعری کو عالمی سمجھوتے کا، اور اس طرح امن کا ذریعہ قرار دیا، اس دور میں غیر مغربی دنیا سے رشتہ آج کے دور کے مقابلے میں بہت مختلف تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی میں اہل مغرب نے حیرت اور دہشت سے مسلمانوں کو بحر روم تک اپنی فتح کا جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن وہ عرب جنھوں نے اندلس پر صدیوں تک حکومت کی۔ یہ ان کا ہی فیض تھا کہ مغرب نے جدید سائنس کی بنیادیں ورثے میں پائیں۔ یورپ میں جدید دور کی شروعات تک رازی اور ابن سینا کی طبی تصانیف معیاری کتب تھیں اور ابن رشد کی تحریروں نے فلسفۂ مذاہب کی بحثوں کو راہ دی اور اس طرح روشن خیالی (Enlightment) کے دور کے لیے راہ ہموار کی۔ طلیطلہ[2] کے مترجمین وہ یہودی ہوں، یا عیسائی یا مسلمان، پر امن طریقے سے مل جل کر رہتے تھے، انھوں نے عرب علم و فن کو مغرب کی میراث بنا دیا۔ کٹیالونیا[3] کے عالم ریمون (Ramon Lull) کی تعلیم تھی کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے ساتھ احترام اور عزت کا برتاؤ کریں۔ اور اس کا کہنا تھا کہ یہ احترام اور عزت صرف بحث و مباحث پر تمام نہ ہونا چاہئے بلکہ ایک مشترک مقصود کے حصول کی تکمیل یعنی امن کی نشو و نما کے لیے گامزن ہونا چاہیے۔

۱۵۲۵ میں ترکوں کے محاصرۂ وی آنا کے بعد سے تو ترکوں کے بارے میں خوں ریزی اور خوں خواری سے بھرے ہوئے ڈراموں کا رواج ہونے لگا۔ یہ ڈرامے ترک مخالف، یعنی اسلام مخالف، ادب کا مستقل حصہ بن گئے۔ پھر بھی اسی زمانے میں اہل یورپ کو مشرق کی تہذیب کے دوسرے اور اچھے پہلوؤں کے بارے میں اطلاع اپنے مسافروں اور تاجروں کے معروضی بیانات سے ملی۔ مزید بر آں،

اٹھارویں صدی کی شروعات میں الف لیلہ کے اولین فرانسیسی ترجمے نے مغرب کو ایک ایسی مشرقی دنیا دکھائی جو پریوں، جنات اور جسمانی دلکشیوں سے بھری ہوئی تھی اور جس نے کئی نسلوں تک شاعروں، مصوروں اور موسیقاروں کو فیضان دیا۔ اس زمانے میں روشن خیالی کی تحریک کی وجہ سے عربی اسلامیات اور ساتھ ساتھ ہندوستانیات کو بھی علوم کی دنیا میں ایک مستقل مرتبہ حاصل ہو گیا۔ سب سے پہلے تو اس قسم کے عالمانہ مکالموں اور ترجموں نے مشرقی طرز کی شاعری کی لہر چلا دی جس کا سر براہ گوئٹے[۴] تھا جس کا مغربی دیوان اور اس کے ساتھ پس نوشت تشریحی مقالہ اسلامی تہذیب کے تجزیوں میں آج بھی بے مثال ہے۔ گوئٹے کے دیوان کے شائع ہونے کے سال بھر بعد ۱۸۲۰ میں جب روکرٹ نے فارسی شاعری سے متاثر اپنی اولین نظمیں شائع کیں تب بھی سامعین "جب دور دراز ترکی میں لوگ آپس میں جنگ و جدل کرتے ہیں" (جیسا کہ گوئٹے نے "ناولٹ" میں لکھا ہے) جیسی قسم کے اسلام مخالف مصرعوں کو بغیر کسی اعتراض کے سنتے تھے۔

جہاں تک ہمارا اور آپ کا سوال ہے، ہمیں تو ہر روز نہ صرف نئے حادثوں کی خبر ملتی ہے اور نہ ہم بچ سکتے ہیں ماس میڈیا کی بنائی ہوئی اس تصویر سے جو ہمارے سامنے ابھرتی ہے اور جو ہمیں ہیبت سے بھر دیتی ہے اور اگر ہیبت نہیں تو پھر غم سے ضرور بھر دیتی ہے۔ کیا اب بھی ممکن ہے کہ اسلامی تہذیب جس سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے کے ساتھ ہم کوئی مثبت تعلق رکھ سکیں؟ یہ تہذیب یورپ کے اکثر باسیوں کو ناآشنا اور اجنبی سے لگتی ہے اور اس پر ہمیشہ یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ اس میں نہ کبھی کوئی تحریک اصلاح (Reform) آئی اور نہ روشن خیالی (Enlightenment) کا دور۔ لہٰذا جیسا کہ جیکب برک ہارٹ[۵] (Jacab Burk Hardt) نے ایک صدی قبل گہری نفرت کے ساتھ دعویٰ کیا تھا کہ یہ تہذیب تبدیلی کی صلاحیت نہیں رکھتی، آج بھی شاید اکثر لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اسلامی دنیا، انڈونیشیا سے مغربی افریقہ تک پھیلی ہوئی یہ اسلامی دنیا ہمارے سامنے کتنی مختلف طرح کی ثقافتوں کا نمونہ پیش کرتی ہے؟ اور پھر بھی اس کی مشترک بنیادیں توحید الٰہی پر اعتقاد محکم اور محمد ﷺ کو نبی آخر الزماں جاننے پر قائم ہیں۔ لیکن ایسے زمانے میں جب ہمارے سامنے مسلسل سیلاب ہے ایسی

اطلاعات کا جن میں سے تفصیلات حذف کر دی کر دی گئی ہیں اور جو مختصر کر کے صرف نگاہوں کو متوجہ کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں، یہ تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی طرز حیات کے مختلف رنگوں میں فرق کیا جا سکے اور اس کے مثبت اور نرم تر پہلوؤں کو پہچانا جا سکے۔

مشہور عربی اور یونانی کہاوت ہے "انسان ہر اس شے کا دشمن ہے جسے وہ جانتا نہیں"۔ یہ تیرہویں صدی کے عظیم صوفی شاعر مولانا روم نے ایک نثری قصہ لکھا ہے: ایک لڑکا اپنی ماں سے ایک سیاہ پوش وجود کے بارے میں بتاتا ہے جو اسے ڈرانے کے لیے بار بار اس کے سامنے آتا ہے۔ آخر کار اسکی ماں اس سے کہتی ہے کہ تم اس ڈرامائی شبیہ سے بات کرو۔ ہم کسی شخص کے جواب سے ہی اس کی شخصیت اور کردار پہچان سکتے ہیں۔ جیسا کہ فارسی شاعروں نے بار بار کہا ہے: لفظ اپنے بولنے والے کا کردار اپنی خوشبو کے ذریعے نمایاں کر دیتا ہے۔ بادام کی روٹی میں لہسن بھرا ہوا ہو تو وہ دیکھنے میں چاہے جتنی لذیذ ہو اس کی مہک اس کے اصل کردار کی غمازی کر دیتی ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "ایک عمدہ لفظ ایک عمدہ پیڑ کی طرح ہے" اور اکثر مذاہب میں لفظ کو خلاقانہ قوت مانا گیا ہے۔ لفظ کشف کا حامل ہے، چاہے وہ نصرانیوں کے اعتبار سے خداوند تعالی کو حرف مجسم ہو چاہے وہ اسلامیوں کے اعتبار سے خداوند تعالیٰ کا حرف وحی ہو۔ لفظ وہ اچھی شے ہے جو انسان کو سونپی گئی، جس کو اسے برقرار رکھنا ہے۔ اسے کمزور نہیں کرنا ہے، جھوٹا نہیں بنانا ہے، اسے اور نہ ہی، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، زیادہ استعمال کرنے سے اسے مار ڈالنا ہے۔ کیونکہ اس میں اپنی قوت ہے جس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ لفظ کی یہی قوت شاعر کے کندھوں پر غیر معمولی ذمہ داری رکھ دیتی ہے اور اس سے زیادہ مترجم پر، جو معنی کے ایک غلط کنایے سے خطرناک غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔

قدیم عربوں کا اعتقاد تھا کہ شاعر کے الفاظ تیر کی طرح ہوتے ہیں۔ ابھی حال میں خلیجی جنگ کے دوران عراقی آمر صدام حسین نے شاعروں کے کلام کو اپنے عزم فتح کو شہرت دینے کے لیے استعمال کیا۔ اسلامی دنیا میں شاعری کی قوت ہماری دنیا کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ہم پر موسیقی اثر کرتی ہے، مسلمانوں پر عموماً لفظوں کی آواز۔

میں نے شہر استنبول کو کوچہ بہ کوچہ، گوشہ بہ گوشہ ترکی شاعروں کے کلام کے ذریعے دریافت کیا۔ وہ کلام جو پانچ سو برس سے شعرا اس حیرت انگیز شہر کے بارے میں کہتے اور پڑھتے رہے ہیں۔ پاکستان کی تہذیب سے محبت میں نے ان نغموں سے حاصل کی جو پاکستان کے تمام صوبوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ ہارورڈ میں پڑھنے والا میرا ایک طالب علم سوئے اتفاق سے تہران میں دیگر امریکیوں کے ساتھ یرغمال بنالیا گیا تھا۔ جب اس نے فارسی کے کچھ شعر پڑھ کر سنائے تو اس نے اپنے نگہبانوں کے رویے میں خاصی تبدیلی محسوس کی۔ اچانک ایک مشترکہ محاورہ ان کے درمیان وجود میں آگیا تھا۔ اس نے چاہے وقتی طور پر سہی لیکن بہر حال گہرے تصوراتی اختلافات کی دوری کم کرنے میں مدد کی۔

مجھے ہرڈر (Herder)[۶] کی یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ "ہم ملکوں اور زمانے کے بارے میں شاعری کے ذریعہ زیادہ علم حاصل کر سکتے ہیں بہ نسبت ان سچی جھوٹی سیاسی اور جنگی تاریخوں کے۔ ان کے طور طریقے، فریب اور زحمت سے بھرے ہوئے ہیں۔"

انیسویں صدی کے اردو شاعروں نے جو لمبے لمبے مرثیے امام حسینؓ کی شہادت پر لکھے وہ انگریزوں کی نو آبادیاتی حکومت کی نکتہ چینی بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے معنی کی تہوں کو اسی طرح کھولنا چاہیے جس طرح کسی کوڈ (Code) کو توڑا جاتا ہے تاکہ ہم ان کے دھماکہ خیز سیاسی پیغام تک پہنچ سکیں۔ آج بھی شاعری ایک ایسا گوشہ ہے جہاں آمرانہ حکومتوں کے استبداد کے تلے بھی لوگ چھپ کر خاموشی کے ساتھ اور خفیہ طریقے سے تہذیبی آب وہوا کو بدلنے کے لیے کام کر سکتے ہیں۔

ہرمن ہسے[۷] کی Morgenland Faiirt سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ اس نے ۱۹۵۵ میں اس انعام کو قبول کرتے وقت اپنی تقریر میں کہا تھا۔ "شاعر کا کام کسی مروجہ حقیقت کو اپنے کلام میں جگہ دینا اور اس کے قصیدے پڑھنا نہیں ہے۔ بلکہ اس مروجہ حقیقت کے ماورا حسن، عشق اور امن کے امکانات کو ظاہر کرنا ہے۔" کیا لبنان کے شاعر ایڈونس (Adonis) نے یہی بات نہیں کہی تھی جب خانہ جنگی کے خوف اور دہشت بھرے زمانے میں اس نے لکھا تھا۔

ایک گلاب اٹھالو، اسے پھیلا کر تکیہ بنالو
کچھ دیر بعد
کمزوری تمہیں کھا جائے گی
گدی تاریک گرد میں
بھاری بم باری تمہیں
اپنا شکار بنالے گی
کچھ دیر بعد
ایک گلاب لو اور اسے گیتوں کا نام دو
اور ساری دنیا کے لیے اسے نغمہ بنا کر گاؤ۔

اسلامی متاخرین شعرا پر صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ لیکن جیسا کہ عموماً ہوتا آرہا ہے، اس اسراری صوفیانہ رنگ کو محض ظلمت پسندی یا مزاریت کے مساوی قرار دینا نہیں چاہئے۔ یا اسے روشن خیالی کے بعد آنے والی نسل کے لیے بے معنی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اکثر صوفی اسراری شعرا ان چیزوں کے خلاف بغاوت کرتے تھے جنھیں وہ بے انصافی، یا بے ایمان حکومت، یا کٹھ ملاؤں کی شکل میں دیکھتے تھے۔ ایسے کٹھ ملا جو بقول امام غزالی "طلاق کے اصولوں کے باریک سے باریک نکات تو جانتے تھے، لیکن خدا کی ذات سے بالکل نا آشنا تھے۔"

سبھی مذاہب کی صوفی اسراری روایات میں یہی رجحان نظر آتا ہے۔ نصرانیوں کے اولیا، چاہے وہ مرد ہوں یا عورت، اپنے ملکوں کی تقدیر کو بدلنے کے لیے کوشاں رہتے۔ اور یہی بات مشرقی یورپ کے یہودی قاصد اولیا[8] پر بھی صادق آتی ہے جیسا کہ ہمیں مارٹن بیوبر Martin Buber[9] کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ یہ لوگ روحانی اقدار کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اس لیے وہ سماج کے اکثر رسوم کے زبردست نقاد اور سماجی انصاف کے علم بردار بن گئے۔ اسلام کی تاریخ میں بہتیرے ایسے صوفیوں کے نام ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی خدا اور اس کی مخلوق کی محبت کو حاصل

کرنے میں گزار دی۔ ان میں سب سے عظیم نام منصور حلاج کا ہے جنھیں ۹۲۲ میں بغداد میں سزائے موت دی گئی۔ اس سزا کی وجہ ان کے بے باک مذہبی عقائد کے ساتھ ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی تھیں۔ آج بھی وہ مسلمانوں کے لیے ایک علامت ہیں۔ کچھ ملا ان سے نفرت کرتے ہیں اور وہ لوگ ان کی تحسین کرتے ہیں جو انھیں خدا کی بے ریا محبت کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ ارباب اقتدار کے خلاف جنگ کا مجاہد بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کی ایک تمثیل ہے کہ پروانہ دراصل نئی زندگی حاصل کرنے کی خاطر خود کو شمع پر قربان کر دیتا ہے۔ اس نے گوئٹے کی مشہور نظم Selige Sehnsucht کو فیضان بخشا۔ اس "شہید عشق حقیقی" کی روحانی معراج اقبال کی طویل فارسی نظم "جاوید نامہ" میں ایک منظر کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ اس نظم میں حلاج جدید شاعر کو متنبہ کرتے ہیں۔

انچہ من کردم تو ہم کردی بہ ترسی
محشرے بر مردہ آوردی بہ ترس

حلاج کا نام وہ نام ہے جسے تمام اسلامی ملکوں میں روشن خیال شعرا بار بار ذکر میں لاتے ہیں۔ حلاج کے قول کا مطلب یہ ہے کہ شاعر نے انسان کو غیر ضروری قانونیت کی محجر دنیا سے نکال کر زندہ کر دیا، انسانی ذمہ داری کا منکر ہو کر نہیں بلکہ انسان کے اصل عملی کردار کی تکمیل کر کے۔ کیا یہ قرآن میں نہیں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے "بنی آدم کو عزت بخشی۔" (سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۰ ترجمہ فتح محمد خان جالندھری)"اس طرح کے انھیں ایک قیمتی چیز عطا کی (سورہ احزاب آیت ۷۲)۔

پاکستان کے بابائے روحانی علامہ اقبال کی شاعری اسلام کی جدید کی تعبیر کی بہترین مثال ہے۔ ۱۹۳۰ کی دہائی میں ان کے اشعار ہندوستان میں سبھی کی زبان پر تھے۔ زیادہ عوام غیر تعلیم یافتہ تھے اور انھیں شاعری کے ذریعہ ہی متاثر کیا جا سکتا تھا، کیونکہ شاعری بہ آسانی یاد ہو جاتی ہے۔ رومی اور گوئٹے سے متاثر ہو کر اقبال نے ایک متحرک اسلام کا تصور پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھیں بخوبی یہ معلوم تھا کہ انسان کا فریضہ ہے کہ وہ خالق کی مرضی کے مطابق اس کی پیدا کردہ دنیا کو بہتر بنائے، اور اسے کوشش کرنی چاہیے کہ بدلتے ہوئے زمانے میں زندہ رہنے کے لیے قرآن کے لا مختتم تفسیری امکانات

سے استفادہ کیا جائے۔ لیکن انھوں نے یہ بھی سکھایا کہ محض عقل پر کبھی مکمل تکیہ نہ کرنا چاہیے۔ ہر چند کہ جدید ٹکنالوجی اور ترقی سراہنے کے قابل ہیں، اور انسان کے لیے ضروری ہے کہ ان میں حصہ لے۔ اپنی ایک مرکزی نظم "پیام مشرق" (جو کہ گوئٹے کے "مغربی دیوان" کا جواب ہے) میں اقبال لکھتے ہیں کہ علم اور عشق یعنی تنقیدی تجزیہ، اور محبت آمیز امتزاج، دونوں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے ہی مستقبل کی مثبت اقدار پیدا ہو سکتی ہیں۔

مندرجہ بالا بحث ہمیں ایسے نکتہ پر لے آتی ہے جو دن بدن میرے لیے اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ غیر تہذیبوں کی محبت آمیز فہم کرنے کا مسئلہ۔ افسوس یہ ہے کہ لفظ "فہم" آجکل غیر تنقیدی رضامند غلطیوں کے معانی کا مرادف قرار دیا جا رہا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ حقیقی تاریخی سچائیوں کے علم سے پیدا ہوتی ہے جو بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔

سینٹ آگسٹائن نے کہا تھا کہ "انسان اسی حد تک کسی چیز کو سمجھتا ہے جس حد تک اسے چاہتا ہے۔" اور ہمارے قرون وسطی کے علمائے دین جانتے تھے کہ "محبت عقل کی آنکھ ہے۔" اس پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ محبت میں عشق اندھا ہو جاتا ہے، لیکن میرا اعتقاد ہے کہ گہری محبت انسان کی آنکھیں کھول دیتی ہے، اور ہمیں اپنے معشوق کی کمزوریاں اور غلطیاں دیکھ کر کسی اور کی کم زوریوں کو دیکھنے سے زیادہ رنج ہوتا ہے۔ ہم مستشرقوں نے اپنی ساری زندگی اسلامی دنیا کے سیکڑوں پہلوؤں کا مطالعہ کرنے میں گذار دی اور ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کے مثبت پہلوؤں کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ وہ لوگ جنھیں اس پیچیدہ دنیا کا بہت کم علم ہے اپنی غلط فہمیاں دور کر سکیں۔ اس لیے پچھلی چند دہائیوں میں اسلامی دنیا کے کچھ حصوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر ہمیں اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ صدمہ پہونچا ہے۔

ایسے معاشرے میں جہاں لوگ ایک دوسرے سے ملنے پر لفظ سلام (جو عبرانی لفظ "شالوم" کی طرح ہے) سے ایک دوسرے کو مخاطب کرنا ضروری سمجھتے ہیں، آج ہم ایسی صورت حال دیکھ رہے ہیں کہ کٹھ ملائیت قانون پرستانہ موقفوں پر لوگ بھیانک حد تک تنگ نظری اور سختی کا رویہ اختیار کر رہے

ہیں۔ پہلے ہم سمجھے تھے کہ یہ مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کی طرف ایک قدم ہے تا کہ مومن اس سیدھے راستے پر چلیں جو خدا کے پیغمبر حضرت محمدؐ نے دکھایا ہے۔ اب لیکن یہ ظاہر ہے کہ بات در اصل یہ نہیں ہے۔ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے حلقوں میں ہمارا سامنا صرف طاقت ور سیاست سے ہے اور ایسی آئیڈیالوجی سے ہے جو اسلام کو کم و بیش نعرے کے طور پر استعمال کرتی ہے اور اسکے اور اسلامی مذہبی بنیادوں کے درمیان کوئی خاص قدریں مشترک نہیں ہیں۔

کم از کم میں نے تو نہ قرآن مجید میں اور نہ حدیث میں ایسا کچھ دیکھا اور پڑھا ہے جو دہشت پھیلانے اور ضمانت کے طور پر لوگوں کو قید کرنے کا حکم دے، یا کم سے کم اسے جائز ہی قرار دے۔ اسلامی اخلاقیات کا اہم حصہ اعتدال کا سنہرا اصول ہے۔ کوئی بھی ذی ہوش شخص دہشت کے عمل کو معاف نہیں کر سکتا، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رونما ہو اور چاہے کسی بھی نظریۂ خیال میں اس کے بیج ہوں۔ اور ہم مستشرقین سے بڑھ کر کوئی اور خوش نہ ہو گا اگر مروجہ رائے مختلف رائے رکھنے والے لوگ یا تنقیدی نظر رکھنے والے مفکرین کو سزائے موت یا سزائے قید سے محفوظ رکھا جائے اور ایک بار پھر سچے مکالمے کی جہت پیدا ہو۔ زیادہ تر انتہا پسند کٹھ ملا یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن میں فرمایا گیا لا اکراہ فی الدین، یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ اور یہ کہ پیغمبرؐ نے اپنے ماننے والوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ کسی اور کو کافر قرار نہ دیا جائے۔ کٹھ ملا اپنے پیرووں کی بھرتی بیکار اور بے جڑ نوجوانوں میں سے کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو چند آسان مذہبی نعرے سکھا کر بڑی آسانی سے اپنی مرضی کے مطابق چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن سیاسی طور پر استعمال کیا گیا اسلام، اصلی اسلام سے بہت مختلف ہے۔ سیاسی اسلام تو، جیسا کہ طاہر بن جالون نے لکھا ہے، اصلی اسلام کا محض کارٹون ہے، کیونکہ وہ "ایسے سیاسی عقیدے کی نمائندگی کرتا ہے جو آج سے کچھ عرصے پہلے تک عربی-اسلامی دنیا میں وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔"

بہر حال، مختلف اسلامی ملکوں میں اکثر مغرب کی شکل بھی اس قدر توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی ہے کہ ہمیں مشرق اور مغرب دونوں کو اصل صورت حال سے واقف کرانا ضروری ہو گیا ہے۔ حیرت کی

بات تو یہ ہے کہ روشن خیال باشعور مسلمان بھی اپنی تاریخ اور ان کارناموں سے بہت کم واقف ہیں جو دوسرے حصوں میں مسلمانوں نے سرانجام دیے ہیں۔ اور جب نرمی سے انھیں اپنے ہی معاشرے کی عظیم روایات سے متعارف کیا جاتا ہے تو وہ بہت حیران ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ وہ روایات ہیں جو آج تہہ زمین ہیں لیکن وہ مسلمانوں کو ایک جدید مستقبل کی طرف لے جاسکتی ہیں، خاص کر ایسا جدید مستقبل جو صحیح معنوں میں انکا اپنا ہے۔ اور خیال رہے کہ ان کو یہ بات نرمی سے بتائی جائے، استاد کی طرح تنبیہ کرتے ہوئے نہیں، کیونکہ اسکا نتیجہ فوراً الٹا ہو سکتا ہے اور اسے تہذیبی نو آبادیاتی استعمار قرار دیا جاسکتا ہے۔

میں یہ سب کچھ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہی ہوں، وہ تجربہ جو میں نے پچھلے چالیس برس میں مختلف مشرقی ملکوں میں انگنت لکچروں کے ذریعہ حاصل کیا ہے، ان دنوں میں جب میں ایک نسبتاً نو عمر غیر مسلم عورت ہوتے ہوئے بھی انقرہ یونیورسٹی کی اسلامی دینیات کے نئے شعبے میں تاریخ ادیان کے پروفیسر کی کرسی پر متمکن تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی کی یونیورسیٹیوں میں بہ مشکل ہی کوئی عورت پروفیسر ہوا کرتی تھی۔ میرے فرائض میں نصرانی گرجا کی تاریخ اور اصول وعقاید بھی پڑھانا شامل تھا۔ اور ایک بہت ہی اہم بات ہے ہم عموماً بھول جاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ یعنی 'روح اللہ' اور ان کی والدہ ماجدہ بی بی مریمؑ کا قرآن اور اسلامی عقیدے میں کتنا اہم حصہ ہے۔ کبھی کبھی ہمیں نوالس (Novalis) [10] کا وہ فقرہ ذہن میں لانا چاہئے جو اس نے اپنے ناول (Heinnich von Otherdingen) میں طلیمہ سے کہلوایا تھا۔ طلیمہ ایک مسلمان عورت تھی جو بیت المقدس میں قید تھی۔ "میں ادب کے ساتھ عرض کرونگی کہ ہمارے شاہوں نے تمہارے ولی کے مزار کا احترام کیا۔ تمہارے ولی کو ہم بھی خدا کا پاک پیغمبر مانتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر ان کا مقدس مزار خوشگوار اتحاد اور میل جول اور کبھی نہ ختم ہونے والے باہمی رشتوں کا مرکز بن جاتا۔"

یہودیت، نصرانیت اور اسلام، تینوں میں آخر الایام کے زمانۂ امن کا تصور موجود ہے جب شیر اور بکری منصف حاکم کے دور میں ساتھ ساتھ رہیں گے۔ لیکن امن کوئی جامد شے نہیں ہے۔ "اس کی

تہذیب کو فروغ دینے میں مذہب کی اہمیت" کے موضوع پر یونسکو نے اپنے اعلانیہ (دسمبر ۱۹۹۴) میں کہا ہے کہ "امن ایک سفر ہے، کبھی نہ ختم ہونے والا ایک عمل" امن جیتی جاگتی حرکت ہے جو ہمارے اندر سے شروع ہوتی ہے۔ صوفیاے کرام کے مطابق اصلی جہاد تو ان کے اندر ان کے اپنی نفس کے سرور کو مٹانے کی جدوجہد ہے۔ اور جب انکی روحیں بالآخر اطمینان قلب حاصل کر لیں گی تب وہ دنیا میں امن کے قیام کے لیے جدوجہد کر سکیں گے۔

کچھ لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اسلام کا یہ تصور جو میں پیش کر رہی ہوں بے حد عینی ہے اور تلخ سیاسی حقیقت سے بہت دور ہے۔ لیکن مورخ ادیان کی حیثیت سے میں نے سیکھا ہے کہ عین کا مقابلہ غین سے ہونا چاہئے۔ سویڈن کے لوتھرن بشپ(Lutheran Bishop) تار آندرے (وفات ۱۹۴۸) جو اپنے وقت کے سربرآوردہ ماہر اسلامیات تھے، اپنی سیرت رسول اللہ میں لکھتے ہیں "کسی بھی مذہب کو یہ حق ہے کہ دوسری روحانی تحریکوں کی طرح ان کا بھی محاکمہ اسکی نیت اور عقائد کی روشنی میں کیا جائے نہ کہ ان جھوٹے نقوش کی روشنی میں جو انسانی کمزوریوں اور درماندگیوں نے اس کے بارے میں پیدا کیے ہیں۔"

اسلام کا میرا اپنا تصور، میری دسیوں سال پرانی اسلامی ادب اور فن میں دلچسپی سے ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ، ساری دنیا میں ہر طبقے کے مسلمانوں سے دوستی کے ذریعہ متشکل ہوا ہے۔ وہ سارے دوست جنھوں نے مجھے اپنے گھروں میں جگہ دی اور مجھے تہذیب سے روشناس کرایا۔ میں ان کے احسان کے قرض سے لدی ہوئی ہوں جن کے ایک ادنٰی سے ٹکڑے کا اعتراف میں آج کرنا چاہتی ہوں۔ سولن جن (Solingen)[11] کی ترک خاتون مولود گنج کی طرح کے لوگ، جس نے ان سب کو معاف کر دیا جنھوں نے اسکے خاندان کے بہت سارے لوگوں کو مار ڈالا، میرے لیے اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ اسلام جس کو میں برسوں سے جانتی ہوں۔ اور میں اپنے والدین کی شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے مذہبی آزاد خیال کے ماحول میں پالا۔ ایسا ماحول جو شاعری میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنے اساتذہ،

شرکائے کار اور شاگردوں کی بھی میں احسان مند ہوں جن میں سے ہر ایک نے میرے تصورات کے افق کو اپنے اپنے طریقے سے وسیع کیا۔

میں جرمن بک ٹریڈ اسوسی ایشن(German Book Trade Association) کی بھی شکر گزار ہوں جس کی کمیٹی میں یہ جرات تھی کہ میرا انتخاب کرلے اور مجھے ان ممتاز شخصیتوں میں شامل کرے جنھیں یہ انعام مل چکا ہے۔ چودھویں صدی کے عظیم شمالی افریقی فلسفی ابن خلدون نے اپنی کتاب کے ایک باب کے عنوان کو یوں قائم کیا ہے۔ ''عالم وہ ہے جو روزمرہ کی سیاست کے معاملات کے بارے میں اور لوگوں کے مقابلے میں سب سے کم معلومات رکھتا ہے۔'' لیکن بہر حال آج کے ادیب مفکر کا فرض یہ ہے کہ وہ مختلف تہذیبوں کو سمجھے اور سمجھائے۔ ۱۹۵۳ میں مارٹن ہیوبر نے اس بات کی نشان دہی کی تھی کہ دوسرے لوگوں کے وجود کو قبول کرنا ہی مکالمے کی بنیاد ہے۔ اور یہ بات مغرب اور اسلامی دنیا کے درمیان تعلقات کے معاملے میں بھی صادق آتی ہے۔ حالانکہ مشرق مغرب کی آویزش اور سرد جنگ کے ختم ہونے کے باعث یہ خطرہ ہے کہ مغرب میں اب اسلام کو ''نئے دشمن'' کے پیکر میں پیش کیا جائے گا۔ پھر بھی ہیوبر کی طرح مجھے بھی مکالمے پر یقین ہے جو بقول اس کے ''قائم ہے دوسرے کے وجود کو اس طرح قبول کرنے پر جیسا کہ وہ ہے۔ کیونکہ اسی طرح اختلافات مغلوب کئے جاسکتے ہیں اگرچہ پوری طرح سے ختم تو نہیں کیے جاسکتے۔''

میری راہ اعلان عام کی راہ نہیں ہے۔ یہ دھوم دھڑکے سے خالی ہے۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل
تو گھس جائے بے شبہہ پتھر کی سل۔۔۔

جن الفاظ سے جرمنی کی وفاقی جمہوریہ کے صدر نے مجھے مخاطب کیا وہ میری حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اور میں دعا کرتی ہوں کہ عالمی امن قائم کرنے میں تھوڑی بہت کار گزاری کی طاقت مجھے بھی دی جائے۔ اول و آخر بہر حال میں اس پروردگار کی شکر گزار ہوں جس کے بارے میں گوئٹے نے اپنے ''دیوان مغرب'' میں کہا ہے:

مشرق خدا کی ملکیت ہے
مغرب خدا کی ملکیت ہے
شمال اور جنوب کے دیس
اس کے ہاتھوں کی امان میں آسودہ ہیں۔
وہی واحد منصف حاکم ہے، وہ
سب کی بھلائی سوچتا ہے، رحمٰن ہے
اس کے سو ناموں میں سے
اس نام کی حمد و ثنا ہو
اور اس کی ثنائیں گائی جائیں۔

حواشی:

[1]۔FRIEDRICH RUEKERT جرمن رومانی ناول نویس اور شاعر (مترجم)۔

[2]۔موجودہ Toledo اسپین میں مسلمانوں کا آباد کیا ہوا شہر (مترجم)۔

[3]۔CATALONIA موجودہ اسپین کا ایک خود مختار علاقہ (مترجم)۔

[4]۔ اس بارے میں مزید معلومات کے لیے اقبال کا شہرہ آفاق دیباچہ "پیام مشرق" ملاحظہ ہو (مترجم)۔

[5]۔سوکس مورخ (۱۸۱۹-۱۸۹۷) (مترجم)۔

[6]۔Johann Gottfried von Herder (۱۷۴۴ تا ۱۸۰۳) جرمن پادری، فلسفی اور نقاد جس نے جرمن رومانیت کی نظریہ سازی کا کام انجام دیا (مترجم)۔

[7]۔Hermann Hesse (۱۸۷۷ تا ۱۹۶۲) جرمن ناول نگار-۱۹۴۶ کا نوبل انعام اسے ملا تھا (مترجم)۔

[8]۔ Chassid یا Hasid یہ یہودی مذہبی رہنماؤں کا ایک طبقہ جو اٹھارہویں صدی میں وجود میں آیا۔ یہ لوگ تصوف کی طرف مائل تھے (مترجم)۔

[9]۔Martin Buber (۱۸۷۸ تا ۱۹۶۵) یہودی فلسفی اور ماہر دینیات (مترجم)۔

۱۰۔ جرمن ناول نگار فریدرش نان ہارڈن برگ (۱۷۷۲ تا ۱۸۰۱) کا قلمی نام نووالس جرمنی کے عظیم ترین رومانی ادیبوں میں شمار کیا جاتا تھا (مترجم)۔

۱۱۔ مغربی جرمنی میں ایک شہر جہاں کے ترک شہریوں کو کچھ برس ہوئے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا (مترجم)۔

مراجع:

Jaffer, Nina. *A Good Word Is Like a Good Tree by Annemarie Schimmel.* www.amaana.org/articles/schimtree.htm.

شمل، این میری۔ ”اسلامی تہذیب، شعر و ادب اور آج کی دنیا“۔ شب خون، جولائی ۱۹۹۷، ۴۲-۴۸۔

(بشکریہ: شب خون، جولائی ۱۹۹۷۔ پروفیسر مہر افشاں فاروقی کی اجازت سے)